مضمون

مضمون نثر کی وہ صنف ہے جس میں کسی خاص موضوع پر اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کو مبسوط و مربوط انداز میں قلم بند کیا گیا ہو۔ مضمون نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس موضوع پر مضمون لکھ رہا ہے سب سے پہلے اس کے بارے میں ضروری علمی مواد جمع کرے پھر اس مواد کو مختلف پیراگراف میں تقسیم کر کے پیش کرے۔ پہلے اپنے موضوع کا تعارف کرائے' پھر ان دلائل و براہین کو پیش کرے جو اس کے موضوع کی حمایت یا مخالفت میں ہوں اور آخر میں کوئی نتیجہ برآمد کرے۔

مضمون جس نوعیت کا ہو' زبان بھی ویسی ہی لکھنی چاہیے۔ اگر مضمون سائنسی' تاریخی یا مذہبی نوعیت کا ہو تو ان علوم وفنون کی مروجہ اصطلاحات وتراکیب کا استعمال ہونا چاہیے۔ اسی طرح تاثراتی یا بیانیہ نوعیت کے مضامین یا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی زبان آسان اور سادہ ہونی چاہیے تا کہ ہر ذہن کا قاری ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ شاعرانہ زبان صرف تاثراتی قسم کے مضامین کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

مضمون میں خیالات کا مرتب و منظم ہونا ضروری ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اُسے ترتیب و تنظیم سے پیش کرے۔ اگر خیالات منتشر یا منطقی ربط سے محروم ہوں گے تو مضمون مطلوبہ اثرات پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔

مضمون اور مقالے میں معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ مضمون مختصر ہوتا ہے جبکہ مقالہ طویل ہوتا ہے۔ مضمون میں موضوع کے اعتبار سے سادہ زبان بھی استعمال کی جا سکتی ہے اور بیان میں شگفتگی بھی ہوتی ہے جبکہ مقالے میں سنجیدگی اور علمی وقار ہوتا ہے۔ مقالے میں مقالہ نگار اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا انداز تحقیقی اور عالمانہ ہوتا ہے۔ مضمون سطحی معلومات بہم پہنچاتا ہے جبکہ مقالے کے مضامین میں زیادہ گہرائی ہوتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز سرسید احمد خاں نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' سے کیا۔ اس رسالے نے سرسید کے علاوہ شبلی' نذیر احمد' مولوی چراغ علی' محسن الملک اور وقار الملک جیسے مضمون نگار پیدا کیے۔ ان کے بعد کے مضمون نگاروں میں مولوی عبدالحق' فرحت اللہ بیگ' سر عبدالقادر' عبدالحلیم شرر اور حافظ محمود شیرانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جدید دور کے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ' سید وقار عظیم' ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سرسید احمد خاں

سالِ ولادت: ۱۸۱۷ء　　　　سالِ وفات: ۱۸۹۸ء

سرسید احمد خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد شاہجہان کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے اور شاہی دربار میں ملازم ہوئے۔ سرسید کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ سرسید کے والد نہایت قناعت پسند انسان تھے اور والدہ بے حد ذہین اور نیک خاتون تھیں۔ زمانے کے دستور کے مطابق سرسید نے قرآن مجید، عربی، فارسی اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ نیز ریاضی، ہیئت، منطق، صرف و نحو اور علم بیان میں بھی کمال حاصل کیا۔ ذوق شعر و سخن سرسید کو ورثہ میں ملا تھا۔ غالب اور مومن کی صحبتوں نے ان کے ذوق و شوق کو مزید جلا بخشی۔

وہ ۱۸۳۸ء میں دہلی میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے سب جج کے عہدے پر پہنچ گئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے سرسید کو جواد الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۵۵ء میں صدر امین ہو کر بجنور میں مقیم ہو گئے۔ دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو وہ اپنی والدہ کے ہمراہ میرٹھ روانہ ہو گئے۔ انھی ایام میں انسانی ہمدردی کے تحت انھوں نے کئی انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید کے صاحبزادے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان روانہ ہوئے تو سرسید بھی اپنے بیٹے کے ہمراہ چلے گئے تاکہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کر سکیں۔ چنانچہ جب ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر کالج کے قیام کا ارادہ کیا اور علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا جو بتدریج ترقی کرتے ہوئے کالج اور پھر یونیورسٹی بن گیا۔

سرسیّد نے اپنی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری اور اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے مسلمان قوم کو زیورِ تعلیم اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی راہ دکھائی۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے ستر برس کی عمر میں پنشن لی اور تمام تر مشکلات کے باوجود آخری دم تک اپنا مشن جاری رکھا۔

سرسید کی اہم تصانیف یہ ہیں:-

آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، خطبات احمدیہ، تصحیح آئینِ اکبری، تاریخ سرکشیِ بجنور، سفرنامۂ انگلستان، کلمۃ الحق، مضامینِ تہذیب الاخلاق، اور قرآن مجید کی تفسیر۔

رسم ورواج

جولوگ کہ حسنِ معاشرت اور تہذیب اخلاق وشائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں اُن کے لیے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم ورواج کو اچھا اور کسی کو برا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم ورواج کو پسند کرتی ہے اور اُسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی چھٹپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا' عادت پڑ گئی' وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہوا اور عادت نہ پڑی وہی بری ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں' بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔ رسم ورواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اُس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا، عیب نہیں لگاتا کیونکہ سب کے سب اُس کو کرتے ہیں مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہٖ بری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ بس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسا کر لینا نہ چاہیے بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اُس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو جو حقیقت میں بد ہو اور بہ سبب رسم ورواج کے ہم کو اُس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اُس کے رواج وعدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے تو اس طرح کسی امر کے رسم ورواج کو اچھا یا برا قرار دے دیں گے۔ بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جب کہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا برائی فی نفسہٖ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اُس طریقے کے تلاش کرنے اور اُسی کے مطابق اپنی رسوم وعادات کی بھلائی یا برائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیے۔

سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور اُن تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں اور اُس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسوم ورواج کے ساتھ برتنی چاہیے تاکہ جو رسم وعادت ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بری ہے اُس کے چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو رسم وعادت دوسروں میں اچھی ہے اُس کو بلا تعصب اختیار کریں اور جو اُن میں بری ہے اُس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔

جب کہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسوم وعادات مروّج ہیں اُنھوں نے کس طرح اُن قوموں میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے اُن رسومات وعادات کے اُن کا مبدا اور منشا متحد معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروّج ہیں اُن کا رواج یا تو ملک کی آب وہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا اُن اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن ومعاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسری قوم کی تقلید واختلاط سے مروّج ہو گئی ہیں یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اُس کو پیدا کر دیا ہے۔ بس ظاہراً یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم وعادات کے مروّج ہونے کا مبدا و منشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُن کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے اُن کو سکھلائی ہیں۔ جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔

مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے، مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لیے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اُٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریقۂ تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں اور عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلا شبہ بمقابل اُن قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے۔ پھر خواہ اس نام سے ہم برا مانیں یا نہ مانیں انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ و تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اُسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔

دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اُس قوم سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اس لیے کہ ہم کو اُس رسم سے تو موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اُس کی حقیقی بھلائی یا برائی پر غور کرنے کا، بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اُس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربے کی ملتی ہیں جو اُس رسم کے اچھے یا برے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادے کے اور اُن کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں، جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملات زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں یا کوئی نئی رسم مشابہ اُس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے طریقِ معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجے کی تہذیب پر پہنچاویں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بنظرِ حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظرِ تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں اُن کو چھوڑیں اور جو قابلِ اصلاح ہوں اُن میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالتِ ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں اُن بری رسموں اور بد عادتوں کے چھوڑنے پر مائل ہوں اور جیسا کہ اُن کا پاک اور روشن ہزاروں حکمتوں سے بھرا ہوا مذہب ہے، اُسی طرح اپنی رسوماتِ معاشرت و تمدّن کو بھی عمدہ اور پاک و صاف کریں اور جو کچھ نقصانات اُس میں ہیں گو وہ کسی وجہ سے ہوں، اُن کو دور کریں۔

اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ میں اپنے تئیں اُن بد عادتوں سے پاک و مبرّا سمجھتا ہوں یا اپنے تئیں نمونۂ عاداتِ حسنہ جتاتا ہوں یا خود ان امور میں مقتدا بننا چاہتا ہوں، حاشا وکلا، بلکہ میں بھی ایک فرد اُنھیں افراد میں سے ہوں جن کی اصلاح دلی مقصود ہے، بلکہ میرا مقصد صرف متوجہ کرنا اپنے بھائیوں کا اپنی اصلاحِ حال پر ہے اور خدا سے اُمید ہے کہ جو لوگ اصلاحِ حال پر متوجہ ہوں گے، سب سے اوّل اُن کا چیلا

اور اُن کی پیروی کرنے والا میں ہوں گا۔ البتہ مثل مخمور کے خراب حالت میں چلا جانا اور روز بروز بدتر درجے کو پہنچتا جانا اور نہ اپنی عزت کا اور نہ قومی عزت کا خیال و پاس رکھنا اور جھوٹی شیخی اور بے جا غرور میں پڑے رہنا مجھ کو پسند نہیں ہے۔

ہماری قوم کے نیک اور مقدّس لوگوں کو کبھی کبھی یہ غلط خیال آتا ہے کہ تہذیب اور حسنِ معاشرت و تمدن صرف دنیاوی امور ہیں جو صرف چندروزہ ہیں، اگر ان میں ناقص ہوئے تو کیا اور کامل ہوئے تو کیا اور اس میں عزت حاصل کی تو کیا اور ذلیل رہے تو کیا، مگر اُن کی اس رائے میں قصور ہے اور ان کی نیک دلی اور سادہ مزاج اور تقدس نے اُن کو اس عام فریب میں ڈالا ہے جو اُن کے خیالات میں اُن کی صحت اور اصلیت میں کچھ شبہ نہیں مگر انسان امور متعلق تمدن و معاشرت سے کسی طرح علیحدہ نہیں ہوسکتا اور نہ شارع کا مقصود اُن تمام امور کو چھوڑنے کا تھا۔ پس اگر ہماری حالتِ تمدّن و معاشرت ذلیل اور معیوب حالت پر ہوگی تو اُس سے مسلمانوں کی قوم پر عیب اور ذلت عائد ہوگی۔ پس ہماری دانست میں مسلمانوں کی حسنِ معاشرت اور خوبی تمدّن اور تہذیبِ اخلاق اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو دنیاوی امور سے جس قدر متعلق ہے اُس سے بہت زیادہ معاد سے علاقہ رکھتا ہے اور جس قدر فائدے کی اُس سے ہم کو اس دنیا میں توقع ہے اُس سے بہت بڑھ کر اُس دنیا میں ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔

(مقالاتِ سرسیّد)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں:

i- دنیا میں کون سی قومیں مہذب یا تہذیب یافتہ گنی جاتی ہیں؟

ii- ہر قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو کیوں پسند کرتی ہے؟

iii- کیا بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے؟

iv- پرانی رسموں کی پابندی سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

i- جو رسوم و رواج کہ بتقضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں، ان کے صحیح اور درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ii- جن باتوں کی بچپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

iii- یہ بات صحیح نہیں کہ برائی اور بھلائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔

iv- ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بہ سبب اختلاط اور ملاپ اور بغیر مقصد و ارادے کے اور ان کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں۔

3- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:

i- سر سید احمد خاں نے کس صنفِ ادب کو اپنایا؟

ا۔ شاعری　　ب۔ افسانہ

ج۔ مضمون　　د۔ آپ بیتی

ii- سرسید احمد خاں نے کس جذبے کے تحت لکھا؟

ا۔ شہرت کی خاطر ب۔ شوق کی خاطر

ج۔ مصروفیت کی خاطر د۔ قوم کی اصلاح کی خاطر

iii- سرسید کے جاری کردہ رسالے کا نام کیا تھا؟

ا۔ مخزن ب۔ تہذیب الاخلاق

ج۔ شاہکار د۔ نیرنگِ خیال

iv- اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کس نے کیا؟

ا۔ شبلی نے ب۔ نذیر احمد نے

ج۔ سرسید نے د۔ حالی نے

4- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل آتا ہے۔ نئے الفاظ شامل ہوتے اور پرانے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''جاوے'' اب متروک ہے، اس کی جگہ ''جائے'' لکھا جائے گا۔

اس مضمون میں موجود متروک الفاظ کی فہرست تیار کریں۔

5- ''رسم و رواج'' کا خلاصہ لکھیں۔

6- مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح کریں:

سب سے مقدّم اور سب سے ضروری امر............اختیار کرنے سے بچتے رہے۔

7- سرسید احمد خاں کے طرزِ نگارش پر نوٹ لکھیں۔

☆☆......☆☆......☆☆